TAMSAAL
ISSN Print: 3007-5939
ISSN Online: 3007-5947
Volume 4, Number 7, 2026, Pages 401 – 413
Journal Home Page
https://tamsaal.pk/index.php/tamsaal/index

ریاض قدیر کے افسانوں کا موضوعاتی مطالعہ

A Thematic Study of Riaz Qadeer's Short Stories

Mohsin Zahoor[1], Ferdous Ehsan[2], Dr. Munawar Amin[3]

[1,2]*M.Phil Scholar Urdu, University of Southern Punjab Multan*
[3]*Assistant Professor, University of Southern Punjab, Multan*

ARTICLE INFO

Article History:

Received:	*May*	*10, 2026*
Revised:	*July*	*08, 2026*
Accepted:	*July*	*17, 2026*
Available Online:	*July*	*26, 2026*

Keywords:

Sexuality, Feminine Psychology, Retribution, Exploitation, Social & Psychological Issues
.

Corresponding Author:
Dr. Munawar Amin
Email:
drmunawaramin143@gmail.com

DOI: *https://doi.org/10.59075/tamsaal.v4i7.104*

ABSTRACT

Riaz Qadeer is an empathetic writer who aligns with feminist thought. He desires to secure for women their due dignity, respect, and fundamental human rights. Furthermore, Riaz Qadeer firmly believes in the concept of karma (retribution). Along with the fragrance of love, his short stories also reflect a deviation from it; to him, love is a universal truth at times, and the ultimate lie at others. He has deliberately avoided conventional and typical romantic attitudes. His stories are simple, easily understandable, and free from technical complexities, making it feel as though he is sitting right before us, narrating a tale. He has mostly depicted the deprivations and exploitation present within society. As a voice for the oppressed women of society, Riaz Qadeer addresses the injustices committed by social structures. Feminism encompasses crucial facets of Riaz Qadeer's life and perspective; he stands against the humiliation and dishonor of women and has consistently raised his pen against their exploitation.

OPEN ACCESS

© 2026 The Authors, Published by ULLR. This is an Open Access Article under the Creative Common Attribution (CC-BY 4.0)

Introduction

ریاض قدیر 13 ستمبر 1966ء کو بہاولپور میں پیدا ہوئے۔ ریاض قدیر کا تعلق "خان بریار" سے ہے۔ ان کے آباؤاجداد گورداسپور سے تعلق رکھتے تھے۔ گورداسپور میں موضع بریار آج بھی اس خاندان کی یاد کے طور پر موجود ہے۔ جن کی مادری زبان پنجابی ہے۔ ریاض قدیر نے ابتدائی تعلیم گھر سے حاصل کی۔ 1982ء میں میٹرک کا امتحان امتیازی نمبروں سے پاس کیا۔ 1985ء میں ایف اے میں نمایاں نمبروں سے کامیابی حاصل کی۔ بی اے کی ڈگری 1987ء میں بہاالدین زکریا یونیورسٹی سے حاصل کی۔ 1995ء میں اسکالرشپ پہ لندن سے انگلش ٹیچنگ کورس مکمل کیا۔ 1991ء میں صادق پبلک سکول بہاولپور میں تقرری

ہوئی۔ ریاض قدیر نے جماعت نہم میں ایک کہانی "زندگی" کے عنوان سے لکھی جو مقامی اخبار میں شائع ہوئی۔ اس کے علاوہ انگریزی زبان میں شاعری بھی کرتے تھے جو "ڈان" اور "دی نیشن" اخبار میں شائع ہوتی تھی۔ اردو سے محبت کی بناء پر 2005ء میں ریاض قدیر نے ایم اے اردو کا امتحان پاس کیا۔ 2009ء میں فرانسیسی مفکر ونقاد مشعل فوکو کی کتاب "The Order of things an Archaeology of Human Science" کا اردو ترجمہ وتنقید کے عنوان سے مقالہ لکھ کر ایم فل اردو اور 2012ء میں پی۔ایچ۔ڈی اردو کا مقالہ "منٹو اور موپساں ایک تقابلی مطالعہ" کے عنوان سے مکمل کر کے ڈگری اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور سے حاصل کی۔

ریاض قدیر نے بطورِ مترجم جہاں خواجہ فرید کے دیوان کو اپنے انگریزی تراجم "Fareed's Fragrance" کے ذریعے دیگر ثقافتوں تک متعارف کرایا، وہی موپاساں کو اُردو دنیا سے جوڑنے میں اپنا کردار بھی ادا کیا ہے۔ ریاض قدیر نے بھی موپاساں کو انگریز مترجمین راجر کالٹ اور ڈیوڈ کاورڈ کے ذریعے سے ہی پڑھا تھا لیکن انگریز مترجمین کے مطالعے کے دوران میں موپاساں کے افسانوں میں پلاٹ اور اختتامیوں کے حوالے سے ان کا عدمِ اطمینان و تشکیک انھیں فرانسیسی زبان میں اصل متون تک لے گئی۔ ریاض قدرنے نمل یونیورسٹی اسلام آباد میں انگریزی و فرانسیسی متون کے تقابل سے اپنے اُردو تراجم کو بہتر بنانے کی کوشش کی بلکہ انھوں نے موپساں کی کہانیوں کی ڈرامائی، تھیٹر، فلمی تشکیل اور ایوارڈ کے حامل افسانوں تک بطورِ خاص رسائی حاصل کی۔ اردو کے معروف نقاد و استاد ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے اپنے جریدے "نگار" کے مسلسل چار "موپاساں نمبر" ریاض قدیر کے تراجم پر شائع کیے اور آخری شمارے میں ریاض قدیر کے طبع زاد افسانوں کو بھی نمایاں جگہ دی۔ ریاض قدیر نے موپاساں کے تین سو افسانوں کے تراجم میں سے 20 کہانیوں پر مشتمل ایک انتخاب "خواب گاہ" کے عنوان سے شائع کیا ۔ان کی تصانیف میں "خواب گاہ" (ترجمہ شدہ افسانے)2009ء، "سرد آگ" (ترجمہ شدہ افسانوں کا دوسرا مجموعہ)2013ء، "برف کے باٹ" (افسانوی مجموعہ) 2014ء، "منٹو اور موپساں-ایک تقابلی مطالعہ" (پی۔ایچ۔ڈی کا مقالہ جو کتابی شکل میں)2016ء، "آنکھ میں سورج" (افسانوی مجموعہ) 2018ء اور "برف کا لمس" (افسانوی مجموعہ) 2019ء اور "گرداس پور کا جٹ" (افسانوی مجموعہ) 2025ء شامل ہیں۔

ریاض قدیر کو 2017ء میں ان کی تعلیمی وادبی خدمات پر ڈسٹرکٹ گورنمنٹ بہاولپور نے "نشان فرید" سے نوازا۔ 2008ء میں ڈسٹرکٹ گورنمنٹ لودھراں کی طرف سے خواجہ غلام فرید کے کلام کا انگریزی زبان میں منظوم ترجمہ کرنے پر انھیں "خواجہ غلام فرید لائف ٹائم ایوارڈ" دیا گیا۔ ریاض قدیر نہایت متحرک شخصیت کے مالک ہیں۔ یہی تحریک ان کی تخلیقی طبع میں بھی نمایاں ہے۔ ان کے افسانوں کے کردار اچھوتے ہیں۔ جو ان کے پیدائشی ادیب ہونے کا عملی ثبوت ہیں۔ بقول ڈاکٹر فرمان فتح پوری:

"پروفیسر ریاض قدیر انگریزی زبان کے استاد ہیں اور ان کا نام اخبارات وادبی رسائل کے ذریعے ایک تواتر کے ساتھ ہمارے سامنے آرہا ہے۔ اس لئے اگر میں کہوں کہ پروفیسر ریاض قدیر کسی تعارف کے محتاج نہیں تو غلط نہ ہوگا۔"(1)

ان کا شمار ایسے ادیبوں میں ہوتا ہے جنہیں شہرت کی کوئی تمنا نہیں۔ وہ بس اپنی حاس طبیعت کی بدولت اپنے ارد گرد کے معاشرے میں موجود مسائل اور ناہموار ریوں کو اجاگر کرنا چاہتے ہیں یہی وجہ ہے کہ انہوں نے جتنا بھی لکھا گہرے مشاہدے اور عمیق مطالعے کے بعد لکھا۔ ریاض قدیر کے افسانے اردو ادب کے منفرد افسانوں میں شمار

ہوتے ہیں۔ معاشرے میں پائے جانے والے ایسے رویے جن پر تبصرہ کرنا معیوب سمجھا جاتا ہے اور ایسے کردار جو بظاہر معاشرے میں محترم اور معزز تصور کیے جاتے ہیں ان کے باطن میں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے ، انہوں نے ایسے کرداروں اور رویوں کی بھر پور عکاسی کی ہے۔ وہ خاموش طبیعت کے مالک شخص ہیں،لیکن وہ سماج اور اُس میں پائی جانے والی برائیوں کو اور لوگوں کے رویے کو بھی گہرائی سے سمجھتے ہیں۔ان کی قوت مشاہدہ ان کے افسانوں کو منفرد بناتی ہے۔ ریاض قدیر کے افسانوں کے موضوعات حقیقی زندگی پر مبنی ہیں۔ان کے کردار جیتے جاگتے ، حقیقی انسانوں کے گرد گھومتے ہیں۔ان کے افسانے سماجی تلخ حقیقتوں کے آئینہ دار ہیں۔

اردو افسانے میں جنسیت نگاری اہم اور جرات مندانہ موضوع رہا ہے۔ اردو میں جنسیت نگاری کا باقاعدہ آغاز پریم چند کی رومانی کہانیوں سے ہوتا ہے۔ منٹو نے اس میں حقیقت پسندی کو شامل کر کے نئی جہت عطا کی۔ عصمت چغتائی نے اس میں عورت کی نفسیات کو بے نقاب کیا۔ آج جدید دور میں افسانے میں یہ موضوع سماجی اور نفسیاتی مسائل کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ ریاض قدیر فیمینزم کی سوچ رکھنے والے حساس فنکار ہیں۔ عورت کو عزت ، وقار اور انسان ہونے کا حق دلانے کی تمنا رکھتے ہیں۔ریاض قدیر مکافات عمل پر بھی یقین رکھتے ہیں۔ ان کے افسانے میں محبت کی خوشبو کے ساتھ ساتھ محبت سے انحراف بھی ہے۔ محبت ان کے نزدیک کہیں آفاقی صداقت ہے تو کہیں سب سے بڑا جھوٹ ۔ انھوں نے روایتی اور مخصوص رومانی رویے کو نہیں اپنایا ۔ ان کی کہانیاں سادہ ، عام فہم اور فنی پیچیدگیوں سے پاک ہیں۔ ایسے لگتا ہے جیسے وہ ہمارے سامنے بیٹھے کہانی سنا رہے ہیں۔ انہوں نے زیادہ تر معاشرے کی محرومیوں اور استحصال کو بیان کیا ہے ۔ ریاض قدیر معاشرے کی مظلوم عورت کی آواز بن کر سماج کی طرف ہونے والی نا انصافیوں کا ذکر کرتے ہیں۔فیمینزم ریاض قدیر کی زندگی کے خاص پہلوؤں کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔وہ عورت کی ذلت اور رسوائی کے قائل نہیں ہیں بلکہ انھوں نے ہمیشہ عورت کے استحصال کے خلاف قلم اٹھایا ہے۔

ریاض قدیر کے بیشتر افسانوں میں عورت ظلم و ستم اور ناانصافی کا شکار ہورہی ہے۔ وہ کہیں مرد ذات کی ہوس کا نشانہ بن رہی ہے تو کہیں اسے فرسودہ قسم کی رسومات کے نام پر بھینٹ چڑھایا جارہاہے۔ ہر جگہ عورت ظلم کی چکی میں پستی نظر آرہی ہے ۔ ڈاکٹر ریاض قدیر کے پہلے افسانوی مجموعے "برف کے باٹ " کے بیشتر افسانوں میں عورت ذات کی مظلومیت کو اجاگر کیا گیا ہے۔ انہوں نے اپنے افسانوں کے ذریعے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ آج کے اس ترقی یافتہ دور میں جب کہ دنیا کہکشاؤں تک رسائی حاصل کر چکی ہے۔معاشرے میں عورت کو صرف جنسی تسکین کا ذریعہ سمجھا جاتا ہے۔ "برف کے باٹ " کے پہلے افسانے "کتے اور گدھ " میں ایک ایسی مجبور اور بے سہارالڑ کی کی کہانی بیان کی گئی ہے جس کے لیے اس کا سہاگن ہونے کا خواب ہی سزا کا باعث بن جاتا ہے وہ باپ کے گھر سے تو بڑے ارمانوں کے ساتھ رخصت ہوتی ہے لیکن معاشرے کے ان نام نہاد لوگوں کے ہتھے چڑھ جاتی ہے جو رات کی تاریکی میں اس کم سن کلی کو اپنی ہوس کا نشانہ بناتے ہیں اور دن کے اجالے میں شرافت کا لبادہ اوڑھ لیتے ہیں۔

"آدھی رات کو ایک موٹے پیٹ والا شخص اندر داخل ہوتا ہے جسے دیکھ کر وہ سہم گئی ہاہاہا۔۔ میں ہی تمہارا دولہا ہوں میں نے تمہارے وزن کے برابر نوٹ دیئے ہیں۔"(2)

اس افسانے کے ذریعے ریاض قدیر نے ان عورتوں کو بے نقاب کیا ہے جو میرج بیورو کی آڑ میں معصوم لڑکیوں کی خوبصورت زندگیوں کا سودا کر رہی ہیں۔ آج تقریبا ہر گھر میں نوجوان بیٹیاں اپنی آنکھوں میں شادی کے حسین خواب سجائے بیٹھی ہیں ۔ اس بات کا فائدہ کچھ انسانیت کی دشمن رشتہ کروانے والی عورتوں نے اٹھا رکھا ہے۔اسی طرح معاشرے کی اس بے حسی کو دوسرے افسانوی مجموعے " آنکھ میں سورج" کے افسانے"ریچھ " میں بھی بیان کیا ہے آج کے اس ترقی یافتہ دور میں جاہل تو کیا پڑھے لکھے بھی جانوروں جیسے خصائل رکھتے ہیں، جن کی نظر کم سن لڑکی ہو یا عورت صرف جنسی تسکین سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔معاشرے کا مرد چند لمحوں کی لذت کی خاطر حوا کی بیٹی کے جذبات کو یہ سوچے سمجھے بغیر مجروح کر رہا ہے کہ اس کے اس فعل سے دہ زندہ لاش بن جائے گی۔ اس افسانے میں اجتماعی زیادتی جیسے برے فعل اور اس کے اثرات کو منظر عام پر لایا گیا ہے۔ جس پر آج پوری انسانیت شرمندہ ہے اس جرم میں نہ صرف مرد بلکہ کم عمر کالج کے لڑکے بھی ملوث ہیں۔

"انہوں نے گرلز برانچ کے چوکیدار کو رشوت دے کر اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرنا شروع کر دیا جو شروع شروع میں ناراض ہوا، مگر سبز اور نیلے نوٹوں کی جھلکیاں اسے رام کرنے کے لیے کافی تھیں۔ اب تو وہ خود انہیں لڑکیوں کے پتے اور ٹیلی فون نمبر دینے لگا تھا۔" (3)

اس افسانے میں بتایا گیا ہے کہ آج کل کے تعلیمی ادارے بھی بیٹیوں کے لیے غیر محفوظ ہیں۔ چاہے دفتر میں بیٹھے کلرک ہوں یا پھر گیٹ پر بیٹھے چوکیدار ، وہ سب چند روپے کے عوض دوسروں کی بیٹیوں کی عزت کا سودا کر رہے ہیں۔جن کی مدد سے امیر باپ کی بگڑی ہوئی اولاد مزے اور ٹائم پاس کے لیے معصوم لڑکیوں کو پھنساتے ہیں اور کبھی کبھی تو وہ حد سے گزر کر اجتماعی زیادتی جیسے جرم میں ملوث ہو جاتے ہیں۔ ایسی صورت حال سےافسانے کی حیا دوچار ہوتی ہےوہ آنکھوں میں بے شمار خواب سجائے کالج پڑھنے جاتی ہے لیکن چند آوارہ درندوں کی درندگی کا شکار ہو جاتی ہے ۔ اور خواب کے ساتھ ساتھ اس کی عزت کی دھجیاں اڑ جاتی ہیں۔

"پہلے لڑکے نے چپکے سے اس کمرے کے اندر سے کنڈی لگا دی جہاں آخری لڑکی اپنے میک اپ کو آخری ٹچ دے رہی تھی۔ جب وہ اپنے پینٹ کی زیپ درست کرتا ہوا باہر نکلا تو دوسراچلا گیا پھر تیسرا چو تھا، پانچواں ، چھٹا آخری بار امداد کی تھی۔" (4)

ریاض قدیر نے اپنے افسانے "ٹیشٹ ٹوپ" میں معاشرے کی ان مجبور عورتوں کی بے بسی بیان کی ہے جو مردوں کی جھوٹی انا کی تسکین اور فضول عقائد اور رسومات کے لیے اپنے جذبات کو پس پشت ڈال کر عزت اور جان دونوں قربان کرتی ہے۔ وہ معاشرے کی پسماندہ، ناخواندہ اور مظلوم عورت کی آواز بن کر اس کے ساتھ ہونے والے ناروا سلوک کو بیان کرتے ہیں وہ اس حقیقت سے بھی پردا اٹھاتے ہیں کہ معاشرے میں شادی شدہ عورت کا مقام ایک نوکرانی یا پھر بچے پیدا کرنے والی مشین سے زیادہ نہیں ہے۔ اگر وہ اولاد پیدا نہ کر سکے تو اس کی زندگی جانوروں سے بھی بدتر بنادی جاتی ہے۔ اور اگر صاحب اولاد ہو تو پوری زندگی خاوند اور بچوں کی خدمت میں گزار دیتی ہے۔ اس کی اپنی کوئی خواہش یا مرضی نہیں ہوتی۔

"ہمارے عقیدے کے مطابق کسی کے ہاں بچہ نہ ہو تو وہ مرد اپنی بیوی کو گھر سے نکال دیتا ہےاور وہ عورت اکثر یتی طبقے کے لوگوں کے ہاں کام کرتی ہے پھر بچہ ہو جاتا ہے اور ہمارے لوگ اس کام کو ٹیشٹ توپ کہتے ہیں۔"(5)

ریاض قدیر کا شمار ان افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے جو بلا خوف و خطر ان موضوعات پر قلم اٹھاتے ہیں جنہیں لوگ زبان پر لانے سے بھی کتراتے ہیں۔ انہوں نے افسانہ "خون گل " میں ان نفسیاتی مردوں کو بے نقاب کیا ہے جو بظاہر معاشرے میں نارمل اور شریف انسان بن کر رہ رہے ہیں لیکن اندر سے وہ کسی حیوان سے کم نہیں ہوتے۔وہ اپنی جنسی ہوس کا شکار ان معصوم پھولوں کو بناتے ہیں جو اپنے اعضا تک سے ناواقف ہوتے ہیں۔

" اب کسی نو عمر بچی کو دیکھتا تو دل بل کھانے لگتا۔ دماغ کہرانے لگتا۔ پھن تن جاتا۔۔۔ آنکھیں سرخ ہو جاتیں، جسم اکڑ کر فولاد بن جاتا۔بازوؤں اور ٹانگوں کا گوشت پھٹتا ہوا محسوس ہوتا۔"(6)

اس طرح کے ذہنی مریض کو لڑکی کے نام سے ہی ہیجانی کیفیت محسوس ہونے لگتی ہے وہ معصوم بچیوں کو دیکھتے ہی درندے بن جاتے ہیں۔وہ نہ صرف ان کے ساتھ زیادتی کرتے ہیں بلکہ ان معصوم کلیوں کو جانوروں کی طرح نوچتے اور کاٹتے ہیں جس کے تصور سے ہی دل دہل جاتا ہے ۔

" منہ میں کپڑا ٹھونس کر اس کے نازک اعضا کو دانتوں میں چبایا گیا ریپ کیا گیا،ایک بار نہیں متعدد بار جس سے اس کی موت واقع ہوئی۔اس کے بعد پہلے بلیوں نے گوشت کھایا پھر کتوں نے۔"(7)

ریاض قدیر کاشمار ان افسانہ نگاروں میں ہوتا ہےجو نہ صرف معاشرے پر گہری نظر ڈالتے ہیں بلکہ اپنے ارد گرد بسنے والے لوگوں کے مسائل کو اپنے افسانوں کا موضوع بناتے ہیں۔ ریاض قدیر نے اپنے افسانوں میں انہی معاشرتی رویوں کو بیان کیا ہے جن سے اس معاشرے کی عورت زمانے کی ہوس کا نشانہ بننے کے لیے آمادہ نہیں ہے لیکن وہ اندر ہی اندر ہر پل ٹوٹتی اور مرتی رہتی ہے۔افسانہ "برف کے باٹ " میں دفتروں میں کام کرنے والی عورتوں کے ساتھ نارواسلوک اور زیادتی کو بیان کیا گیا ہے جو ان کے لیے شدید کرب اور ذہنی اذیت سے کم نہیں ہوتا۔

"وہ اب بھی کسی خوبصورت لڑکی کو دیکھ کر پاگل ہو جاتا ۔ جب سے اس کی ترقی ہوئی تھی اس کے ماتحت کئی لڑکیاں تھیں جنہیں وہ بہانے بہانے سے اپنے پاس بلا کر باتیں کرتا اور کبھی کبھی موقع پاکر فائدہ بھی اٹھا لیتا۔"(8)

معاشرے کی عورت مجبوری کے تحت گھر سے باہر قدم رکھتی ہے، کسی کو اپنے گھر کا سہارا بننا ہو تا ہے تو کسی کو اپنا جہیز بنانا ہوتا ہے جبکہ کچھ شہناز اکبر جیسی بیوہ اپنے بچوں کا پیٹ پالنے کے لیے ملازمت کرتی ہیں لیکن ہر جگہ ملک محمد افضال جیسے جنسی مریض انہیں اپنی ہوس کا نشانہ بنانے کی تاک میں رہتے ہیں۔ انہیں ملازم پیشہ عورت کے مسائل سے کوئی غرض نہیں۔وہ تو بس اپنی جنسی تسکین کے لیے ان کی مجبوریوں کا فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں۔

"دوسروں کی عزت سے کھیلتے ہو اور اپنی عزت کو محفوظ سمجھتے ہو ۔۔۔ ؟ اور دوسروں کے لیے اور؟ ۔۔۔۔ ایک ہی دکان پر دو بھاؤ۔۔۔؟ اپنے لیے کچھ تو لتے ہو اور دوسروں کے لیے کچھ اور ؟ برف کے باٹ لے کر دھوپ میں بیٹھے ہو ؟" (9)

ریاض قدیر نے شہناز اکبر کے ذریعے سماج کے مردوں کو آئینہ دکھایا ہے کہ کسی کی بیٹی پر ہاتھ ڈالتے وقت انہیں یہ نہیں بھولنا چاہیئے کہ ان کے گھر بھی شہناز اکبر جیسی عورتیں موجود ہیں۔ معاشرے کا مرد منافق ہے، وہ دوسروں کی بہن بیٹی پر بری نظر ڈالتا ہے جبکہ اپنے گھر کی بیٹی کا محافظ بنتا ہے۔ اسی طرح افسانہ " آنکھ میں سورج" میں بھی ملازم پیشہ عورتوں کے اس کرب اور اذیت کو بیان کیا گیا ہے، جسے مرد ذات سمجھنے سے قاصر ہے ، جسے ریاض قدیر نے کچھ ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

" جو لڑکی کے اندر آتے ہی اسے نظروں سے دبوچ لیتے ۔ ان کی آنکھوں سے شہوت کی وحشت برستی، ہوس کی گولیاں آنکھوں سے نکل کر لڑکی کے جسم کے آر پار ہو جاتیں۔ اس کا دل کس قدر چھلنی اور روح کتنی زخمی ہوتی ہے اس کا اندازہ اس دفتر میں کام کرنے والے کسی مرد کو نہ ہوتا۔" (10)

دفتروں میں کام کرنے والے مردوں کے درمیان اگر ایک عورت آجائے تو وہ ان کے لیے ایک جنسی موضوع بن جاتی ہے۔ وہ اس خاتون کے وزن، کمر، جسم کے زاویوں سے لے کر چلنے کے انداز ، کپڑوں ، میک اپ ، بات کرنے کے اسٹائل، غرض ہر ایک پہلو پر مزے لے لے کر بات کرتے ہیں۔ وہ اس بات کی پرواہ نہیں کرتے کہ ان کی اس قسم کی گفتگو سے ایک شریف عورت کے دل اور روح پر کیا گزرتی ہے۔ریاض قدیر اپنے افسانوں کے توسط سے معاشرے کے دفتری ماحول کو بیان کرتے ہیں چونکہ وہ خود ایک اعلی ادارے میں کام کرتے ہیں جہاں خواتین کی ایک اچھی خاصی تعداد ملازمت کر رہی ہے ۔ اس لیے وہ دفتر میں ہونے والی گفتگو اور رویے سے بخوبی واقف ہیں ، جسے انہوں نے اپنے افسانوں میں بے دریغ استعمال کیا ہے ۔ وہ یہ بتانے کی کوشش کرتے ہیں کہ سماج کا مرد چاہے جتنا پڑھا لکھا ہو وہ اپنی سوچ اور اعمال سے ابھی بھی جاہل ہے۔ دفتر میں کام کرنے والی لڑکیوں سے دو طرح کا رویہ روا رکھا جاتا ہے ، ایک حد کا اور دوسرا اٹھرک بازی کا۔ چونکہ لڑکیاں محنتی اور اپنے کام سے کام رکھنے والی ہوتی ہیں ، اس لیے وہ سب مردوں کی نظر میں کھٹکتی ہیں ، خاص کر سرکاری ملازمین جنہیں حرام خوری کی عادت پڑ چکی ہوتی ہے۔ اگر کوئی ایماندار خاتون ان پر آفیسر تعینات ہوتی ہے تو وہ اسے اپنے راستے کا کانٹا سمجھتے ہیں ، کیوں کہ یہ مردذات کی فطرت ہے کہ وہ عورت کو خود پر غالب آتے برداشت نہیں کر سکتا۔ جب وہ خود کو اس کے سامنے بے بس اور مجبور محسوس کرتا ہے تو اپنی مردانگی کو بنیاد بنا کر درندگی پر اتر آتا ہے اور اس کی عزت پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کرتا ہے۔

"بس اسی طرح تم اوپر سے آکر ہم دونوں کو رنگے ہاتھوں پکڑ لینا پھر تمہارا حصہ پکا۔ مگر کمینے!تو باہر مجھے اپنا جھوٹا کھلاتا ہے۔ کبھی تو میرا جھوٹا بھی کھالے۔"(11)

جب معاشرے میں بے یقینی وبے اعتمادی کی فضاء گھر کر جاتی ہے تو فرد اپنے مسائل بیان کرنے سے زیادہ زندگی سے چھٹکارا حاصل کرنے کو فوقیت دیتا ہے۔ چونکہ اسے اپنے چاروں طرف قول و فعل میں تضاد دکھائی دیتا ہے اس لیے بندش زباں اسے وہ کہنے نہیں دیتی جس کا وہ اظہار کرنا چاہتا ہے ۔ وہ سماج کے اس رویے کو تو بدلنے سے قاصر ہوتا ہے البتہ ان سانسوں کو ختم کر دیتا ہے جو اس سماج کے فرسودہ نظام کی گندی ہوا اس کے اندر داخل کر کے اسے ذہنی اذیت میں مبتلا رکھتی ہیں۔ معاشرے کی اس بے یقینی اور بد اعتمادی کی فضاء سے نوجوان نسل میں

خود کشی جیسے عمل کا رجحان بڑھ گیا ہے ۔ ڈاکٹر ریاض قدیر نے اپنے افسانوں کے ذریعے اس برے فعل کے محرکات سے پردہ اٹھانے کی کوشش کی ہے۔

حقیقی زندگی کی تصویر کشی کرتے ہوئے ریاض قدیر زندگی کو وسیع کینوس پر پھیلا ہوا دیکھتے ہیں ۔ وہ اپنی کہانیوں کے موضوعات میں کسی مسئلے یا پہلو کو ہی اجاگر نہیں کرتے بلکہ اس معاشرے کے افراد ، اس کی سوچ ، ذہنیت اور نفسیات کو بھی بیان کرتے ہیں۔ انہوں نے اپنے چند افسانوں میں معاشرے کی اس بڑھتی ہوئی برائی کو اجاگر کیا ہے جو آہستہ آہستہ پورے سماج کو اپنی لپیٹ میں لے رہی ہے۔ ہمارے طرز احساس اور متضاد رویے کو بیان کیا ہے جس میں اپنے لیے الگ اور دوسروں کے لیے الگ اصول و ضوابط ہوتے ہیں۔رمشہ ربانی جیسے لوگ اپنے آپ کو ایک اصول پرست انسان ظاہر کرنے میں نہ جانے کتنے لوگوں کی حق تلفی کر جاتے ہیں۔ لیکن جب حالات ان کے خلاف ہوتے ہیں تو وہ تمام اصول و ضوابط کو پس پشت ڈال کر صرف اپنے مفادات کے بارے میں سوچتے ہیں اس رویے کو ریاض قدیر نے اپنے افسانے میں یوں بیان کیا ہے :

"میں ورکنگ لیڈی ہوں اسے توجہ نہیں دے سکی۔ اس کا پرانا سکول اپنے معیار کے لحاظ سے گر چکا ہے۔ اگر یہ یہاں داخل نہ ہوا تو اس کا اچھا تعلیمی کیریئر نہیں بن سکے گا۔ میں آپ سے التجا کرتی ہوں کہ ہر سوال میں صرف ایک دو نمبر دے کر پاس کر دیں۔" (12)

جب اس طرح کا متضاد رویہ رکھنے والے افراد بے نقاب ہوتے ہیں تو لوگوں کا نہ صرف ان سے اعتماد اٹھ جاتا ہے بلکہ وہ ایماندار لوگوں کو بھی شک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں جس سے معاشرے میں عدم اعتماد کی فضاء پیدا ہوتی ہے۔یہی صورت حال افسانہ "ہر خوشہ زخمایا " میں بھی بیان کی گئی ہے جس میں سماج کے ان لوگوں کی فطرت کو اجاگر کیا گیا ہے ، جو بظاہر بہت نیک ، شریف اور ہمدرد نظر آتے ہیں لیکن وقت آنے پر وہ اپنا اصلی رنگ دکھا دیتے ہیں ظاہری طور پر تو ان کی زبان شیریں ہوتی ہے لیکن باطنی طور پر وہ سانپ اور بچھو جیسی خصلت کے مالک ہوتے ہیں جو اپنا مطلب نکلنے کے بعد ڈس لیتے ہیں۔

"پڑھ لکھ لینے اور اچھے اداروں میں کام کرنے کے باوجود بنیادی طور پر وہ اندر سے ویسا ہی ہے ، موقع پرست اور احسان فراموش۔ اپنے محسنین کو دھوکا دینا اس کا مشغلہ ہے کسی کو بڑی سے بڑی قربانی دینے پر مجبور کر دینا اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔" (13)

ریاض قدیر اپنے افسانوں میں سماج پر طنز و تنقید کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں آج کا انسان صرف اپنی ذات میں ہی جی رہا ہے اسے اپنے ارد گرد کے لوگوں اور ان کے حالات سے کوئی غرض نہیں ہے ہر ایک کے چہرے سے بے چینی کی کیفیت عیاں ہے سب اپنی جگہ یہی سمجھ رہے ہیں کہ وہ اس معاشرے کے مظلوم لوگ ہیں ، ان کا استحصال کیا جا رہا ہے جس کے نتیجے میں لوگ سب سخت مزاج اور بے حس ہوتے جا رہے ہیں۔ ریاض قدیر سماج کی اس بے حسی کو اپنے افسانہ" ہیں تلخ بہت " میں یوں بیان کرتے ہیں :

"اس کے مرض کا علاج تھا مگر تھا بہت مہنگا۔ میں نے اپنے دفتر کے لوگوں سے چندے کی اپیل کی اور باکس بھی رکھوا دیا آج اسے کھولا تو اس سے محض چند روپے نکلے۔" (14)

اس افسانے میں سماجی بے حسی اور خود غرضی کو نمایاں کیا گیا ہے جن لوگوں کو اللہ نے ہر نعمت اور وافر رزق سے نوازا ہے ، وہ اپنی دولت کو برانڈڈ کپڑوں اور مہنگے ہوٹلوں میں کھانے پر تو خوشی خوشی خرچ کرتے ہیں لیکن جب کسی غریب کی مدد کرنے کا وقت آتا ہے تو اپنی جیبوں میں سکوں کو ٹٹولتے ہیں ۔ سب اپنی زندگی اور خواہشات کی تکمیل میں اس قدر مگن ہیں کہ انھیں اپنے اطراف میں سفید پوش لوگ دکھائی نہیں دیتے ۔ اسی طرح ریاض قدیر افسانہ " مسیحائی " میں ان مسیحاؤں اور عزت دار لوگوں پر طنز کرتے ہیں، جن کا پیشہ تو خدمت خلق ہے لیکن یہ لوگ اپنے لالچ کی وجہ سے نہ صرف اپنے مقدس پیشے کی توہین کر رہے ہیں بلکہ انسانیت کے منہ پر تماچا بھی مار رہے ہیں۔ان ڈاکٹروں نے انسانوں کی تکلیف، درد اور بیماری کو دولت جمع کرنے کا ذریعہ بنا رکھا ہے۔

"میڈیسن کے شعبے میں ان مسیحاؤں نے اندھی مچا رکھی ہے۔ بھائی یہ جو دوائیں صرف ڈاکٹر کے اپنے میڈیکل سٹور میں دستیاب ہیں۔دراصل اس کمپنی کی ہیں جو ڈاکٹر کو بے پناہ سہولتیں دیتی ہیں۔" (15)

ایک بیمار مجبور شخص جب ان کے چنگل میں پھنستا ہے تو یہ مختلف طریقوں سے لوٹتے رہتے ہیں۔ کبھی فضول کے ٹیسٹ کرواتے ہیں جن میں ان کا حصہ ہوتا ہے تو کبھی مہنگی دوائیوں کے ذریعے ان کی جیبیں خالی کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ نوکری تو سرکاری کرتے ہیں لیکن مریضوں کو اپنے پرائیویٹ کلینک پر بلاتے ہیں آج مسیحا ہمدرد بننے کے بجائے قصائی کا روپ دھار چکا ہے۔اس افسانے میں ڈاکٹروں کی اس سفاکی کو اجاگر کیا گیا ہے۔

عورت کو صرف جنسی قربت سے ہی سکون نہیں ملتا وہ عزت اور پیار سے بولے جانے والے الفاظ، خیال رکھے جانے کے احساس اور اعتماد کی یقین دہانی بھی کو پسند بھی کرتی ہے۔ مرد جب جنسی قربت کو ہی اہمیت دیتا ہے تو وہ کبھی بھی اپنی شریک حیات کے دل میں جگہ نہیں بنا سکتا۔افسانہ "حوا" میں ریاض قدیر سماج میں پنپنے والی اس برائی کو اجاگر کرتے ہیں جس نے کئی گھروں کو برباد کر کے رکھ دیا ہے اور بیشمار زندگیوں کو لقمہ اجل بنا دیا ہے شک جو کہ دیمک کی طرح رشتوں اور محبت کو چاٹ چاٹ کر اندر سے کھوکھلا کر دیتا ہے۔ شک جب ایک دفعہ دل میں گھر کر جاتا ہے تو وہاں محبت کی گنجائش باقی نہیں رہتی اس افسانے کا مرکزی کردار عاصم اپنی بیوی سے بے پناہ محبت کرتا تھا لیکن شک کی بنیاد پر نہ صرف اسے قتل کر دیتا ہے بلکہ حقیقت معلوم ہونے پر خودکشی بھی کر لیتا ہے یوں شک کے بیج سے ہنستا بستا گھر اجڑ جاتا ہے۔

"ثانیہ بھی سردار عمت اقبال کی عیاشی کا سامان ہے۔۔۔ ؟ نہیں نہیں ایسا نہیں کر سکتا۔ میری ثانیہ ایسی نہیں ہے۔ وہ بار بار اپنے ذہن کو جھٹکا دیتا مگر پھر یہی بات اسے پریشان کرتی۔" (16)

میاں بیوی میں چاہے جتنی محبت ہو لیکن اعتماد اور بھروسہ ہو نا ضروری ہے اگر وہ ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں لیکن راز دار بنانے یا اعتماد پیدا کرنے سے ہچکچاتے ہیں تو شک ان کے دلوں میں جڑ پکڑ نا شروع کر دیتا ہے ، جس سے رشتہ آخر کار اپنی موت آپ مر جاتا ہے اس افسانے میں بھی کچھ ایسا ہی ہوا ہے۔

ریاض قدیر نے اپنے افسانوں میں معاشرے کے اس طبقے کے لوگوں کے مسائل کو بھی موضوع بنایا ہے جو سماج کا ایک اہم لیکن ہر سطح پر نظر انداز طبقہ ہے۔مزدور طبقے کا شروع سے ہی استحصال ہوتا رہا ہے ، نہ تو حکومت اور نہ ہی سماج کا بااثر طبقہ ان کی محرومیوں اور مسائل پر دھیان دیتا ہے یہ طبقہ خاموشی سے بغیر کسی گلے شکوے کے صدیوں سے یوں ہی محرومیوں کے ساتھ اپنی زندگی گزار رہا ہے ، جبکہ یہی مزدور طبقہ ملک کی ترقی میں اہم کردار بھی ادا کرتا ہے ، تمام صنعتیں اور فیکٹریاں انہی کے دم سے رواں دواں ہیں۔ لیکن یہ معاشرے کی بے حسی ہے کہ انھیں سماج کا فرد ہی تصور نہیں کیا جاتا۔ریاض قدیر نے افسانہ "ہیں تلخ بہت " میں اس حقیقت کو بیان کیا ہے کہ ایک مزدور کو اپنے بچوں کی دو وقت کی روٹی کے لیے کتنی دوڑ دھوپ کرنی پڑتی ہے۔ وہ ان چیزوں کے لیے اپنا خون پسینہ ایک کر رہا ہوتا ہے جن کی امیر لوگوں کے نزدیک کوئی حیثیت ہی نہیں ہوتی اس بات کو افسانے میں یوں بیان کیا گیا ہے:

"وہاں پانچ بجے چھٹی ہوتی ہے پھر میں ایک دو گھروں میں مالی گیری کرتا ہوں ۔ بھٹے سے ملنے والی دو سو روپے دیہاڑی سے کچھ نہیں ہوتا جی۔ میرے پانچ بیاریں ہیں ان کی روٹی پوری نہیں ہوندی۔سکول کیویں بھیجوں ؟ (17)

ریاض قدیر کے اس افسانے میں مزدور کی بے بسی ، ان کی حسرتوں کا ذکربہترین انداز میں کیا گیا ہے کس طرح مزدور اپنے بچوں کو پڑھانا بھی چاہتا ہے لیکن پھر بھی اس کی آمدنی اس کے بیٹے کے بہتر مستقبل میں آڑے آتی ہے وہ اپنے اس بچے کو بھی ساتھ میں مزدوری کرواتا ہے۔ ریاض قدیر نے اپنے افسانوں کے ذریعے معاشرے میں بڑھتے ہوئے اس رجحان کی طرف ہماری توجہ دلاتا ہے جس پر بات تو ہر کوئی کرتا ہے لیکن اس کی روک تھام کے لیے کوشش شاید کوئی کرتا ہو۔ سماج میں متوسط طبقے سے لیکر اعلی طبقے تک لوگ کسی نہ کسی انداز سے چائلڈ لیبر کے فروغ میں ملوث نظر آتے ہیں۔ چائے کی دکان سے لیکر بڑی بڑی فیکٹریوں اور کار خانوں تک میں کم عمر لڑکے اور لڑکیاں کام کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔غریب آدمی مجبور ہو کر اپنے لخت جگر کو کم عمری میں ہی کام پر لگادیتے ہیں لیکن سماج کے معزز لوگ ان کی مجبوریوں کا بھرپور فائدہ اٹھاتے ہیں اس جرم میں ملوث افراد کے بارے میں ریاض قدیر اپنے افسانہ " واجب القتل " میں کچھ ایسے سخت الفاظ کا استعمال کرتے ہیں:

"ہاں ہاں واجب القتل جو اپنی اپنی ورکشاپ یا اپنے گھر میں بچوں سے مزدوری کرواتا ہے واجب القتل ہے۔"(18)

اسی طرح افسانے "کتے اور گدھ " میں اس حقیقت سے پردہ اٹھایا گیا ہے کہ آج ہمیں ہر دوسرے گھر میں چھوٹے لڑکے اور لڑکیاں کام کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ وہ آتے تو پڑھنے کے لیے ہیں لیکن بن نوکر جاتے ہیں۔ اپنے مالک کے سامنے سر نہیں اٹھاتے ، بس خاموشی سے کام کیے جاتے ہیں۔

"اسے ایک خاندان نے Adopt کر لیا اور بیٹا بنا کر لے جانے والوں نے اسے گھر کا چھوٹا بنا دیا۔ جو برتن دھونے سے لیکر باہر کا سودا سلف لانے اور مہمانوں کی آؤ بھگت کرنے میں چو بیس گھنٹے لگارہتا۔"(19)

اس افسانہ میں معاشرے کے معزز لوگوں کے متضاد رویے اور بے حسی کو اجاگر کیا گیا ہے۔ آج ہمارے ارد گرد ایسے بے شمار بچے موجود ہیں جن کا بچپن برتن دھوتے دھوتے گزر جاتا ہے اور جوانی کسی جگہ مزدوری کرتے ہوئے ختم ہو جاتی ہے۔ ایسے معلوم ہوتا ہے جیسے ان کا اس دنیا میں آنے کا مقصد ہی دو وقت کی روٹی کمانا تھا۔ریاض قدیر نے

بچیوں کے اس استحصال کا ذکر کیا ہے جس کی جڑیں زمانہ جاہلیت سے جاملتی ہیں پہلے تو بچیوں کو زندہ دفن کر دیا جاتا تھا لیکن آج کل کے ترقی یافتہ دور میں انہیں پیدا ہونے سے پہلے ہی قتل کر دیا جاتا ہے۔ آج کل بیٹیوں کو زندہ دفن تو نہیں کیا جاتا لیکن جدید ٹیکنالوجی کی مدد سے علم ہونے پر دنیا میں آنکھیں کھولنے کی مہلت نہیں دی جاتی آج کل لوگ بیٹوں کے لالچ میں اس قدر اندھے ہو جاتے ہیں کہ وہ اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ انہوں نے خود بھی ایک عورت کی کوکھ سے جنم لیا ہے یہ تلخ حقیقت ریاض قدیر نے افسانے " اور ۔۔۔ سوال کیا جائے گا " میں اس طرح بیان کی ہے :

" آج کل ہم گائنالو جسٹوں کے بڑے مسائل ہیں چند ہفتوں کے بعد بچے یا بچی کا پتا چل جاتا ہے اور لوگ ابارشن کروانے چلے آتے ہیں خود بھی گناہ گار ہوتے ہیں ہمیں بھی کرتے ہیں کبھی کبھی مجھے لگتا ہے ہم ان کی مدد کر کے اقدام قتل میں برابر کے حصے دار بن جاتے ہیں۔" (20)

اس افسانے میں بتایا گیا ہے کہ اس برائی میں صرف جاہل لوگ ہی ملوث نہیں بلکہ دائم جیسے پڑھے لکھے لوگ بھی شامل ہیں والدین تو گناہ گار ہیں ہی، اس گناہ میں ڈاکٹر بھی برابر کے شریک ہیں۔ سماج میں ایک بہت بڑا تضاد دیکھنے میں آیا ہے کہ حلال جانوروں کے معاملے میں تو مادہ بچے کی پیدائش کے لیے دعا کی جاتی ہے جبکہ اپنے لیے صرف بیٹوں کو ترجیح دی جاتی ہے۔سماج میں لڑکیوں کا ہر انداز سے استحصال کیا جاتا ہے کہیں اسے پیدائش سے پہلے مار دیا جاتا ہے ، کہیں طعنے دے دے کر رخصت کیا جاتا ہے ، تو کہیں اس کے جسم کو نوچ کر جنسی ہوس کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔معاشرے میں بس بچیوں کے حقوق کی باتیں کی جاتی ہیں ، ان کو پورا کرنے کے لیے کوئی اقدامات نہیں کیے جاتے ہیں۔

ریاض قدیر حساس طبیعت کے مالک انسان ہیں انہیں سماج کے مسائل اور اس میں موجود برائیاں اس وقت تک سکون و چین نہیں لینے دیتیں ، جب تک وہ انہیں اپنےافسانوں کا موضوع نہ بنالیں۔ انہوں نے ہر طرح کے موضوعات پر لکھا ہے ، چاہے وہ معاشرتی ہو، نفسیاتی ہو یا پھر سماج کے ان ٹھیکیداروں کے بارے میں ہوں جو مذہب کے اجارہ دارہیں۔وہ اپنے افسانہ " الرحمن علم القرآن " میں مذہب کے ان ٹھیکیداروں کو بے نقاب کیا ہے جنہوں نے دین اسلام کو اپنی ذاتی ملکیت سمجھ رکھا ہے یہ افسانہ ریاض قدیر کی آپ بیتی معلوم ہوتا ہے۔افسانہ کا کردار دین دار گھرانے سے تعلق رکھنے کی وجہ سے مذہب کے ساتھ خصوصی لگاؤ رکھتا ہے، جس کی بنیاد پر اس نے اپنے علم میں اضافے اور رب کی خوشنودی حاصل کرنے کا ارادہ کیا ہے اور اپنی مصروفیت سے وقت نکال کر ایک مسجد میں قرآن حفظ کرنے کے ارادے سے گیا وہاں پہنچ کر اسے احساس ہوا کہ یہاں کا ماحول تو اس کی سوچ کے برعکس ہے ایک معلم نہ صرف دوسرے معلم سے بلکہ اس کے طلباء بھی حسد کرتے ہیں ان مذہبی ٹھیکیداروں کے قول و فعل میں تضاد ہے جسے وہ کچھ اس طرح سے بیان کرتا ہے:

" تم ہم سب کو گنہ گار کر رہے ہو تمہاری داڑھی ہی نہیں۔ تمہاری اذان تو جائز نہیں ہے ہم سب کی نماز نہیں ہو گی۔ کیا غضب کرتے ہو چلو ۔۔۔۔ چند دن بعد دیکھا کہ وہی مولوی صاحب اپنے گیارہ سالہ بیٹے کو اذان کے لیے لاؤڈ سپیکر کے پاس لے گئے اور اس سے اذان دلوائی۔"(21)

ہمارے یہاں کچھ مولوی حضرات کا رویہ اہل کلیسا جیسا ہوتا ہے جو خود جائز نا جائز کا فیصلہ کر کے اپنا مفاد حاصل کرنے میں مصروف ہیں انہوں نے مسجدوں اور مدرسوں کو اپنی ملکیت سمجھ رکھا ہے۔قرآن حفظ کر کے اور لمبی لمبی داڑھی رکھ کر سمجھتے ہیں کہ انہیں رب کی طرف سے جنت کا ٹکٹ مل گیا ہے۔یہ چند نام نہاد مولوی حضرات بڑی بڑی تقریروں میں جو درس دیتے ہیں خود اس کا الٹ کرتے ہیں وہ خود کو معتبر اور دوسروں کے گناہ گار ہونے کے بارے میں گمان کرتے نظر آتے ہیں ان کی نظر میں بس اسلام کے حقیقی پیروکار وہ خود ہیں ان کی ذات کے لیے گناہ کا تصور ہی جیسے ختم ہوگیا ہو اپنے کئے گئے ہر عمل کو جائز سمجھتے ہیں اورخدا کے گھر میں بھی غلط کام کرنے سے نہیں کتراتے۔

ریاض قدیر کے یہاں موضوعات کا جتنا تنوع ہے، شاید ہی کسی معاصر افسانہ نگار کے یہاں ہو۔انسانی معاشرت اور نفسیات کا کوئی بھی حصہ اُن کی نگاہوں سے اوجھل نہیں رہ پاتا۔اُن کی تخلیقی دنیا وسیع ہے۔یہ ایک ایسے تخلیق کار کی دنیا ہے، جس پر ہر رنگ کی کہانیاں وارد ہوتی ہیں۔ریاض قدیر کا چوتھا افسانوی مجموعہ "گرداس پور کا جٹ 2025"ء میں منظر عام پر آیا۔اس افسانوی مجموعہ کا عنوان پہلی ہی نظر میں قاری کو سیاسی اور تاریخی حقیقت نگاری کا سامنا کرنے کے لیے تیار کرتا ہے۔"اٹھائیس مئی دو ہزار چوبیس"، "گرداس پور کا جٹ" اور "برف کے پیڑ" جیسے افسانوں میں تقسیم ہند، شناخت کے بحران اور تہذیبی ناسٹیلجیا کو موضوع بنایا گیا ہے۔ اِن افسانوں کے پس منظر میں ریاض قدیر کا پختہ سیاسی شعور، تاریخی ادراک اور ترقی پسند نظریہ متحرک دکھائی دیتا ہے۔ مگر واقعہ نگاری اور متحرک کرداروں کی عدم موجودگی نے اس افسانوی مجموعے کو صحافتی بیانیے میں بدل دیا ہے۔"گرداس پور کا جٹ" اِس مجموعہ کا بہترین افسانہ ہے،اس افسانہ کی کہانی لگ بھگ دو صدیوں پر محیط ہے۔ مصنف کا خود کردار کی صورت میں اپنے مرحوم دادا سے مکالمہ اِس افسانے کو طلسماتی، تخیلاتی اور سیاسی حقیت نگاری کا ایک ایسا دلچسپ اور منفرد قصہ بنا دیتا ہے جس کے ذریعے قاری زیریں اور بالائی پنجاب کی ایک متوازی تاریخ سے متعارف ہوتا ہے۔

ریاض قدیر کے افسانوں کا غالب موضوع جنس ہے، جن میں سے کچھ براہِ راست، اور کچھ بالواسطہ پدر شاہی نظام کی مخالفت کرتے ہیں۔ وہ ایک فیمنسٹ افسانہ نگار ہیں، مگر اُن کے یہاں فیمنزم کی اساس، لبرل ازم سے زیادہ مارکسی ازم اور پوسٹ موڈرن ازم پر استوار ہے غالباً یہی سبب ہے کہ ان کی تحریروں میں جہاں استحصالی مردانہ نظام کی ستائی ہوئی عورتیں ملتی ہیں، وہیں جاہ پرست عورتوں کے ہاتھوں تذلیل کا شکار مرد بھی نظر آتے ہیں۔ تاہم، مصنف یہ بات واضح کرنا نہیں بھولتے کہ عورتوں کی یہ جاہ پسندی اصل میں مردانہ اقتدار کی نقالی اور ردِ عمل کی نفسیات کا نتیجہ ہے۔"پارسائی کا بوجھ"، "خارزار"، "دھوپ کا باغ" اور "زرد پتوں کا قالین" جیسے افسانے بلاشبہ تانیثی حیات کے حامل ہیں، مگر اپنے موضوع اور تخلیقی کرافٹ کے لحاظ سے "مندروں میں چراغ" اس سلسلے کا شاہکار افسانہ ہے۔

مصنف نے عمومی اسلوب سے ہٹ کر کہانی کے مرکزی کردار، اکبر کمال کو مسلسل ارتقائی مراحل سے گزرتے دکھایا ہے۔ کہانی کے ذریعے بتایا گیا ہے کہ جب ایک حساس مگر روایت پسند ذہن کو محبت اور مردانہ انا میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا پڑتا ہے، تو اس کے لیے اپنی حیاتیاتی نوع کے اجتماعی شعور سے کٹنا کس قدر مشکل ہوتا ہے۔

یہاں ایک فکر انگیز سوال یہ بھی ابھرتا ہے کہ کیا اولاد کا مقصد نسلِ انسانی کا ارتقاء اور تسلسل ہے یا پھر محض اپنے جینز کے تحفظ کے ذریعے لافانی ہونے کی جبلت؟ اس کشمکش میں وہ باریک نقطہ بھی دکھائی دیتا ہے جو ایک مرد کو اس کے اندرونی و حقیقی وجود سے جدا کرتا ہے۔ دوسرے زاویے سے دیکھا جائے تو ریاض قدیر کے افسانوں میں بار بار سامنے آتے بانجھ مرد اور زرخیز عورتیں، دراصل پدر شاہی نظام کے زوال اور مادر شاہی عہد کے طلوع ہونے کا علامتی استعارہ بھی ہیں۔

ریاض قدیر نے اپنی تحریروں میں نفسیاتی حقیقت نگاری کو بہترین انداز میں برتا ہے، جس کی واضح مثال ان کی مختصر کہانی "بدلہ" ہے۔ اس کہانی میں "فرمان" اور "ہادی" نامی دو بالکل مختلف مزاج کے کردار دکھائے گئے ہیں۔ فرمان ایک مثبت اور زندگی سے محبت کرنے والا انسان ہے جس کی ذہنی کشادگی اور محبت اس کی بیوی کو خوش رکھتی ہے۔ دوسری طرف، ہادی ایک منفی اور تخریبی سوچ کا مالک ہے، جس کا استحصالی رویہ اور تنگ نظری اس کے اظہارِ محبت کی ناکامی سے ظاہر ہوتی ہے۔

جب ہادی کو اپنی بیوی سے فرمان کی خوشگوار ازدواجی زندگی کا علم ہوتا ہے، تو اس کا احساسِ کمتری جاگ اٹھتا ہے۔ وہ اس ناکامی کا بدلہ فرمان کو اس کی ملازمت میں نقصان پہنچا کر لیتا ہے۔ ہادی کی سازشوں اور چال بازیوں کی وجہ سے ہی فرمان کو ترقی نہیں مل پاتی۔ ہادی اپنی شادی شدہ زندگی کو بہتر بنانے کے بجائے، ہر اس شخص کی زندگی خراب کرنا چاہتا ہے جو خوشحال ہو۔ ایسے ہی حسد رکھنے والے لوگوں کے بارے میں سارتر نے کہا تھا کہ "دوسرے لوگ ہی دراصل جہنم ہیں"۔ اگر فرائیڈ کے نظریے سے دیکھیں تو فرمان "ایروز" یعنی زندگی، خوبصورتی اور ہمدردی کی علامت ہے، جبکہ ہادی "تھیناٹوز" یعنی تباہی اور موت کا نمائندہ ہے جس کا کام خوشیوں کو برباد کرنا ہے۔

ایک اچھا کہانی کار وہی ہوتا ہے جو اپنے دور کے حالات اور مسائل پر لکھنے سے نہ ڈرے۔ یہ جرات ریاض قدیر کے ہاں ملتی ہے۔ ان کے افسانے "ڈاکے"، "برف کا مرگ زار" اور "میٹری فیگی" اسی سلسلے کی کڑیاں ہیں، جن میں سے "میٹری فیگی" سب سے زیادہ متاثر کن ہے۔ کووڈ کے پس منظر میں لکھا گیا یہ افسانہ مختصر اور سادہ ہونے کے باوجود اپنے بہترین اسلوب، متوازن جذبات اور اثر انگیز انجام کی وجہ سے دل پر گہرا نقش چھوڑتا ہے۔ یہ افسانہ ہمیں یہ احساس دلاتا ہے کہ ہم سب کسی نہ کسی طرح اپنی ماؤں کے وجود کو ختم کرنے کے ذمہ دار ہیں۔ ہم اس ننھے کیڑے کی طرح ہیں جو زندہ رہنے کے لیے اپنی ہی ماں کو کھا جاتا ہے۔ ہم نے بھی اپنی زندگی اور بقا کے لیے اپنی ماؤں کی جوانی اور طاقت کو استعمال کیا ہے۔ اگر گہرائی سے دیکھا جائے تو ہماری پیدائش کے ساتھ ہی ہماری ماؤں کی اپنی ذاتی زندگی ختم ہو جاتی ہے، اور جیتے جی اپنی ذات سے محروم ہو جانا انسان کے لیے سب سے بڑی موت ہے۔

ریاض قدیر جدید اردو افسانے کا ایک ایسا معتبر اور منفرد نام ہیں جنہوں نے روایت کی فرسودہ روش سے ہٹ کر تخلیقی جرات، سچائی اور فکری گہرائی کے ساتھ قلم اٹھایا ہے۔ ان کے افسانے محض کھوکھلی داستان گوئی یا سطحی جذباتیت کا مجموعہ نہیں، بلکہ وہ ہمارے ارد گرد پھیلی سماجی تلخیوں، دفتری منافقت، مزدور کی محرومی اور خاص طور پر پدر سری نظام میں پسی ہوئی مظلوم عورت کے دکھوں کا جیتا جاگتا مرقع ہیں۔ فرانسیسی ادب اور بالخصوص موپاساں و فوکو کے بنظرِ غائر مطالعے نے ان کے مشاہدے کو وہ عمیق اور نفسیاتی حسیات عطا کی ہیں، جس کی بدولت وہ انسانی شخصیت کی گہری تہوں، جنسی الجھنوں اور پیچیدہ رویوں کی بلاخوف و خطر جراحی کرتے ہیں۔ وہ تانیثی فکر اور انسانی وقار کے نقیب بن کر معاشرتی ناہمواریاں بے نقاب کرتے ہیں اور ساتھ ہی اپنے عہد کے سیاسی و تاریخی حالات سے بھی آنکھیں نہیں چراتے۔ ان کا نپا تلا، سادہ اور جاذبِ نظر

اسلوب قارئین کو محض متاثر ہی نہیں کرتا بلکہ انہیں ایک عمیق فکری اضطراب اور خود احتسابی کی دعوت دیتا ہے۔ بلاشبہ، ریاض قدیر کے افسانے اپنی موضوعاتی وسعت، نفسیاتی حقیقت نگاری اور جرات مندانہ لب و لہجے کی بنا پر اردو فکشن کی تاریخ میں ایک پائیدار اور درخشندہ باب کی حیثیت رکھتے ہیں۔

حوالہ جات:

1. ،ڈاکٹر فرمان فتح پوری "موپساں نمبر"، نگار"، جنوری، ص:17
2. ریاض قدیر، "برف کے باٹ"، مثال پبلی شرز، فیصل آباد، 2014ء، ص:21
3. ریاض قدیر، "آنکھ میں سورج"، کتاب نگر نصرت روڈ، ملتان، 2018ء، ص:37
4. ایضا، ص:37
5. ایضا، ص:167
6. ریاض قدیر، "برف کا لمس"، مثال پبلی شرز، فیصل آباد، 2019ء، ص:46
7. ایضا، ص:45،44
8. ایضا، ص:114
9. ریاض قدیر، "برف کے باٹ"، ص:49
10. ایضا، ص:50
11. ریاض قدیر، "آنکھ میں سورج"، ص:17
12. ریاض قدیر، "برف کے باٹ"، ص:114
13. ایضا، ص:123
14. ریاض قدیر، "آنکھ میں سورج"، ص:175
15. ریاض قدیر، "برف کا لمس"، 154
16. ریاض قدیر، "آنکھ میں سورج"، ص:86
17. ریاض قدیر، "برف کے باٹ"، ص:96
18. ایضا، ص:120
19. ریاض قدیر، "آنکھ میں سورج"، ص:34
20. ایضا، ص:80
21.

ریاض قدیر، "برف کے باٹ"، ص:80